© rasailojaraid.com

پروفیسر ایم۔ اے مجید یزدانی

رُومی کی تمثیل نگاری

(قسط ۲)

پس بادشاہ عجز و انکساری کے ساتھ اس مہمانِ غیبی کو محل کے اندر لے گیا۔ بار بار اس سے ہمکنار ہوتا تھا۔ پیشانی پر بوسے دیتا۔ راستے کا حال پوچھتا اور کہتا تھا کہ واللہ! مجھے تو صبر نے بڑا ہی میٹھا پھل دیا کہ تم جیسا خزانہ ہاتھ آگیا:۔

چوتھا سبق (صبر کا انجام اچھا ہوتا ہے)

صبر تلخ آمد ولیکن عاقبت   میوۂ شیریں دہد پُر منفعت

طب اور حکمت

آخر بادشاہ اسے حرم کے اندر لے گیا۔ کنیزک کی بیماری کا تمام قصہ بیان کیا۔ پھر اسے مریضہ کے عین سامنے لے گیا۔ طبیب نے مریضہ کا رنگِ چہرہ دیکھا۔ نبض اور قارورہ کا معائنہ کیا۔ اسباب و علل کو بغور سمجھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ان طبیبوں نے جو کچھ کیا غلط کیا۔ وہ تشخیص ہی نہ کر پائے تو علاج کیا کرتے یہ تو وہی بات ہوئی کہ عمارت تعمیر کرنے کے بجائے مسمار و برباد کر دی جائے۔ طبیب غیبی ایک ہی نظر سے دراصل کنیزک کی بیماری کو سمجھ گیا تھا۔ تاہم اس نے وقتی طور پر بادشاہ کو نہ بتایا۔ مریضہ کی گریہ وزاری سے اس نے بھانپ لیا کہ وہ کسی جسمانی مرض میں مبتلا نہیں۔ وہ تو عشق کے روگ میں گرفتار ہے۔ اس کا جسم اچھا بھلا ہے لیکن اندر ہی اندر گھلا جا تا ہے۔ اس کی زرد رنگت ہی مرضِ عشق کی غمازی کر رہی ہے:

کس طرح سے جانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں   رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

مولانا کہتے ہیں — یہ دل کی بیماری بھی عجیب ہی چیز ہے۔ تمام بیماریوں سے نرالی اور انوکھی —! کیوں نہ ہو، یہی تو وہ بیماری ہے جسے اصطرلابِ اسرارِ خداوندی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ (یہ کہنے کو درد ہے لیکن حقیقت میں خود دوا ہے۔ یہ عشق اگر حقیقی ہو تو اس سے فراق کیسا! اس [illegible] ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گرفتار ہونا تو عین سعادت و خوش بختی ہے۔ بشرطیکہ صحیح معنوں میں عشق ہو ورنہ خواہشِ نفس کو عشق کہنے والے تو بہت ہیں)۔ یہی ہے اس تمثیل کا:

پانچواں حکیمانہ و عارفانہ سبق (عشقِ حقیقی اختیار کرنا عین سعادت ہے)

دید از زاریش کو زارِ دل است ‏ ‏ تن خوش ست و او گرفتارِ دل است (۱۰۸)

عاشقی پیداست از زاریِ دل ‏ ‏ نیست بیماری چو بیماریِ دل (۱۰۹)

علتِ عاشق ز علتہا جداست

(کیونکہ) عشق اصطرلابِ اسرارِ خداست

اور یہ اس لیے کہ عاشقی چاہے اس طرف کی (یعنی مجازی) ہو یا اُس طرف کی (یعنی حقیقی) ہو بالآخر ہمیں اسی شہر و دیار کی طرف لے جاتی ہے ؎

عاشقی گر زیں سر و گر زاں سر است ‏ ‏ عاقبت ما را بداں شہ رہبر است (۱۱۱)

اس شعر میں مولانا نے جس نظریے کا اظہار کیا ہے (کہ عشقِ مجازی بھی بالآخر عشقِ حقیقی میں مبتلا ہو کر ہمیں حق تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے) خاصہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ بعض لوگ اسے محض ڈھونگ سمجھتے ہیں اور بعض اسے حقیقت قرار دیتے ہیں۔ اس سے اگلے شعر کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے عشقِ مجازی کے حق میں واضح اور دو ٹوک فتویٰ نہیں دیا۔ بلکہ کہنا یہ چاہا ہے کہ عشق کی کوئی بندھی ٹکی تعریف یا شرح و توضیح نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے میں نے صرف لفظِ عشق پر زور دیا ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ "اپنی تمام قوتِ زبان و بیان کے باوصف میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ عشق کی شرح کر سکوں۔ سب کچھ کہتے کہتے میں جب بیانِ عشق پر پہنچتا ہوں تو رُک جاتا ہوں۔ بلکہ شرمندہ ہو کر رہ جاتا ہوں" ؎

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں ‏ ‏ چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں (۱۱۲)

پس عشق کی شرح تو عشق ہی کر سکتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ آفتاب کیا اور کیسا ہوتا ہے تو اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ بھائی آفتاب کو دیکھ لو وہ خود ہی بتا دے گا کہ وہ کیا ہے ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ‏ ‏ گر دلیلت باید از وے رُو متاب (۱۱۴)

(اس نکتے کی طرف تکتے رہو تا آنکہ اس کی روشنی، نُور اور خیرہ کن شعاعیں خود ہی بتا دیں کہ ہم آفتاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہیں)۔

آفتاب کے ذکر میں اس کا مترادف لفظ شمس بھی استعمال میں آیا۔ اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ لفظ شمس سے مولانا کا ذہن فی الفور شمس تبریزی کی طرف منتقل نہ ہو جائے جو انھیں خدا اور رسول ؐ کے بعد سب سے زیادہ محبوب تھے بلکہ دیوان میں تو ع "شمسِ من و خدائے من" تک کہنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ چنانچہ بے ساختہ والہانہ انداز میں ذکرِ محبوب میں شعر پر شعر کہتے چلے گئے ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے صرف چند ایک شعر درج کرتے ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ ان کی ایک خاص اہمیت ہے جس کا ذکر ہم کیا چاہتے ہیں :-

شمس تبریزی کہ نورِ مطلق ست آفتاب است و ز انوارِ حق ست[۱]

چوں حدیثِ روئے شمس الدین رسید شمس چارم آسماں سر در کشید (۱۲۳)

واجب آمد چونکہ بُردم نامِ او شرح کردن رمزے از انعامِ او

این نفس جاں دامنم برتافتست بوئے پیراہانِ یوسف یافتست

کز برائے حقِ صحبت سال ہا باز گو حالے ازاں خوش حال ہا

لیکن — من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست شرحِ آں یارے کہ اُو را یار نیست (۱۳۰)

پس اس ذکر کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ اس وقت حکایت جاری رہنے دیں ؎

شرحِ ایں ہجراں وایں خونِ جگر ایں زماں بگزار تا وقتِ دگر (۱۳۱)

کیا یہاں مولانا نے شمس تبریزی کا ذکر محض بے تابیٔ عشق کی بنا پر کیا ہے؟ کیا تمثیل سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور کیا یہ شعر محض بھرتی کے ہیں؟۔ اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ مولانا نے ذکرِ شمس سے صرف دل کی تسکین ہی نہیں چاہی بلکہ اس موقع پر جو بیان دیا ہے اس سے ہم براہ راست یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ فنِ تمثیل کے بارے میں مولانا کا ذاتی تصوّر کیا تھا۔

مولانا رومی کا تصوّرِ تمثیل

مندرجہ بالا آخری شعر کے بعد مولانا نے جو اشعار کہے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ — "ہم نے جو طبیبِ غیبی کو بادشاہ کا محبوب بنایا ہے تو اس لیے کہ ہمارا محبوب شمس تبریزی بھی تو ویسے ہی

---

[۱] یہ شعر نکلسن کے نسخہ مطبوعہ لنڈن میں درج نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مہمان غیبی کی طرح ہمارے پاس آیا تھا جس کی جدائی میں ہم آج تک تڑپ رہے ہیں۔ بلکہ یہ جو دوسروں کی داستانِ عشق دُہرا رہے ہیں تو اصل میں اپنی ہی سرگزشتِ محبت بیان کر رہے ہیں۔ اور کہ یہ تمام شعر و شاعری بھی اسی دردِ دل کے بیان کا ایک بہانہ ہے" ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا   سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

پس یہ داستان درحقیقت ہماری ہی داستان ہے، البتہ نام و مقام و زمان ہم نے بدل دیے ہیں کہ زیادہ لطف اسی میں ہے کہ رازِ دلبر کو فاش نہ کیا جائے بلکہ دوسروں کی سرگذشت کے رنگ میں پیش کیا جائے۔ تاکہ دل کی بھڑاس بھی نکل جائے اور رازِ محبوب بھی رسوا نہ ہو" اس ضمن میں رومی کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں (۱۳۶)

تمثیل کے بنیادی تصوّر کی وضاحت کے لیے اس سے مختصر اور جامع تعریف تلاش کرنا غالباً دشوار ہے۔

اس شعر کے بعد حکایت کی طرف رجوع کرنے سے پہلے جو چند اشعار کہے ہیں وہ حیاتِ شمس کے بارے میں تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے محبوب شمس تبریزی کے ناگہاں غائب ہو جانے کے بارے میں کوئی اہم انکشاف کرنے کے لیے بے قرار ہیں مگر اسے زبان پہ لانا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس سے فتنہ و فساد برپا ہونے بلکہ خونریزی تک نوبت پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہے ؎

(۱۴۲) فتنہ و آشوب و خونریزی مجو   بیش ازیں از شمس تبریزی مگو

پس بادلِ ناخواستہ ذکرِ حبیب سے قصّے کی طرف راجع ہوتے ہوئے لکھتے ہیں کہ طبیب نے مرض کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد بادشاہ سے کہا کہ حرم میں تخلیہ کرا دیا جائے تاکہ وہ مریضہ سے کچھ مزید حالات دریافت کر سکے۔ بادشاہ نے فوراً تعمیل کی (کہ وہ تو اب طبیبِ غیبی کا بندۂ حکم بن چکا تھا)، حرم خالی کر دیا گیا۔ بادشاہ بھی وہاں سے چل دیا۔

نفسیات نگاری

تب طبیبِ غیبی نے کمال ملائمت و شفقت سے پوچھا کہ اے لڑکی تیرا شہر کہاں ہے؟ لیکن ایک ماہرِ نفسیات کی طرح کہ مبادا وہ اس سوال سے چونک اُٹھے ساتھ ہی یہ سوال پوچھنے کی وجہ بھی بتا دی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ ہر شہر کے رہنے والے مختلف المزاج ہوتے ہیں لہٰذا ان کا علاج بھی مختلف طریقے سے کیا جاتا ہے۔ کنیز نے بلا جھجک اپنے شہر کا نام بتا دیا۔ پھر پوچھا کہ اپنے شہر سے باہر تم کہاں کہاں رہی ہو۔ اور کن کن آقاؤں کے پاس رہ چکی ہو؟ ان تمام لوگوں کے نام پوچھتے وقت طبیب نے اس کی نبض اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ یہی اس کی تشخیص کا محور تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جس شخص کے نام پر کنیزک کی نبض پھڑک اٹھے گی وہی دراصل اس کے محبوب کا نام ہو گا۔ کنیزک نے اپنے تمام ہم شہریوں اہل محلہ اور پھر دوسرے مقامات پر رہنے والے اپنے سابق آقاؤں کے نام بتانے شروع کیے لیکن نبض میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ ناگاہ طبیب نے سمرقند کا نام لیا تو طوفانِ اشک اس بیمارِ عشق کی آنکھوں سے امڈ پڑا ؎

آہِ سردے برکشید آں ماہرو　　آب از چشمش رواں شد ہمچو جو

اور سسکیاں بھرتے ہوئے بتایا کہ وہاں ایک زرگر نے اسے خریدا لیکن چھ ماہ پاس رکھ کر فروخت کر دیا۔ یہ کہتے کہتے اس کی نبض غیر معمولی طور پر پھڑک اٹھی، سرخ و سپید رخساروں پر زردی چھا گئی کیونکہ اس محبوب سمرقندی کا غم پھر سے تازہ ہو گیا ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

(۱۶۸) نبض جست و روئے سرخش زرد شد　　کز سمرقندی زرگر فرد شد

طبیب نے اس زرگر کا نام پتہ نشان پوچھ کر اسے تسلی دی کہ اب گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب دورِ فراق ختم ہوا اور کہا کہ اب غم کھانا تمہارا کام نہیں میرا ہے۔ اب تم مجھ سے وہ پیار و شفقت پاؤ گی جو سینکڑوں باپ مل کر بھی نہیں دے سکتے۔ لیکن ساتھ ہی متنبہ کیا کہ خبردار یہ راز کسی پر کھلنے نہ پائے۔ حتیٰ کہ بادشاہ پر بھی ظاہر نہ کرنا۔ اس لیے کہ راز کو راز رکھنے سے ہی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے

چھٹا سبق۔ (راز کو قبل از وقت ظاہر نہ کرنا چاہیے)

طبیب نے کہا کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے راز کو پنہاں رکھا وہ جلد اپنی مراد سے ہمکنار ہوا۔ بیج کو دیکھو کہ زمین میں پنہاں ہو جاتا ہے اور گلستاں کی سرسبزی و شادابی کا موجب ہوتا ہے ؎

(۱۷۵) چونکہ اسرارت نہاں در دل شود　　آں مرادت زودتر حاصل شود

(۱۷۶) گفت پیغمبر کہ ہر کہ سر نہفت　　زود گردد با مراد خویش جفت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دانہا چوں در زمین پنہاں شود   سرِّ آں سرسبزیٔ بستاں شود

غرض طبیب نے کچھ ایسے لطف و مہر سے وعدے کیے کہ کنیز کا سارا خوف دور ہو گیا کیوں نہ ہو سچے وعدے ایسے ہی تو دلپذیر ہوتے ہیں کہ دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جھوٹے (مجازی) وعدے کبھی باعثِ تسکین نہیں ہوتے اُلٹے بے چینی کا موجب ہوتے ہیں:۔

ساتواں سبق (لطفِ عہد اور ایفائے عہد کی فضیلت)

وعدہ ہا باشد حقیقی دلپذیر   وعدہ ہا باشد مجازی تاسگیر (۱۸۰)

وعدۂ اہلِ کرم گنجِ رواں   وعدۂ نااہل شد رنجِ رواں (۱۸۱)

اس کے بعد طبیب بادشاہ کے پاس گیا۔ اس راز سے یونہی اسے معمولی طور پر آگاہ کیا۔ یعنی تفصیلِ عشق بتانے سے گریز کیا، بلکہ یونہی کنیزک کے ذہنی عارضے کا ذکر کیا اور زرگر کا نام بتایا اور کہا کہ اس علاج میں اس سے مدد مل سکتی ہے لہٰذا اُس کی یہاں موجودگی ضروری ہے اور مشورہ دیا کہ انعام و اکرام کا لالچ دے کر اسے یہاں بلوایا جائے۔ تاکہ آپ کی محبوبہ کا علاج ہو سکے۔ بادشاہ نے بسر و چشم قبول کیا اور بہت سا مال و اسباب دے کر قاصدوں کو سمرقند روانہ کر دیا۔ زرگر بادشاہ کا پیغام پا کر بہت خوش ہوا۔ اور مال و دولت دیکھ کر تو اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ عربی گھوڑے پر فخر سے سوار ہوا۔ حالانکہ وہ درحقیقت انعام نہیں بلکہ اس کا خون بہا تھا۔ وہ سفر پر کیا روانہ ہوا گویا خود ہی سوئے قضا چل نکلا ؎

اسپِ تازی بر نشست و شاد تاخت   خوں بہائے خویش را خلعت شناخت (۱۹۲)

اے شدہ اندر سفر با صد رضا   خود بپائے خویش تا سوء القضا (۱۹۳)

یہاں پر مولانا نے قاری کے ذہن میں ایک ڈرامائی تذبذب اور تجسس پیدا کر دیا ہے کہ آخر زرگر کی سفر پر روانگی کو سفرِ موت کیوں کہا جا رہا ہے؟ ساتھ ہی یہ اشارہ بھی کر دیا کہ انسان اپنی تدبیر پر نازاں تو بہت جلد ہو جاتا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مشیتِ ایزدی کو منظور کیا ہے۔ ایسی عاجلانہ رضامندی میں عموماً لالچ کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ زرگر ہی کو لے لیجیے محض مال و دولت کے لالچ نے اسے اندھا کر دیا۔ آخر اتنا تو سوچا ہوتا کہ اس نے کون سا کارنامہ انجام دے ڈالا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو اس پہ یوں عنایت بے جا کی جا رہی ہے ۔ یا اس میں کونسا سُرخاب کا پَر لگا ہوا تھا جو اسے یوں خلعت سے نوازنا لازم تصور کیا گیا ۔ لیکن لالچ کا بھوت سر پر سوار ہو تو ان باتوں کی طرف دھیان جاتا ہی کب ہے ؟ یہ بتا کر مولانا نے قاری کو ذہنی طور پر وہ جھٹکا برداشت کرنے کے لیے ایک حد تک تیار کر دیا ہے جو آگے چل کر محسوس ہو گا جب ہم زرگر کو قتل ہوتا دیکھیں گے !

غرض زرگر شاہی دربار میں پہنچا تو طبیب اسے حرم میں کنیز کے پاس لے گیا ۔ وہ سوختہ جاں اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی ۔ طبیب نے زرگر کو مزید انعام و اکرام دلوانے کے بعد بادشاہ سے کہا کہ اس کنیزک کو اس کے حوالے کر دیا جائے ۔ تاکہ آبِ وصال سے اس کی آتشِ ہجر بجھ سکے ۔ بادشاہ ایک مریدِ فنا فی الشیخ کی طرح فوراً آمادہ ہو گیا اور زرگر کا نکاح کنیزک کے ساتھ کر دیا ۔ چھ ماہ تک دَورِ وصال جاری رہا اور وہ خستہ تن دیکھتے ہی دیکھتے بالکل تندرست ہو گئی ۔

منطق و تخیل کا تصادم

تب اس طبیبِ غیبی نے زرگر کے لیے ایک ایسا شربت تیار کیا جسے پی پی کر وہ روز بروز گھلنے لگا اور اس کا حُسن جمال ماند پڑتے پڑتے بالکل ختم ہو کر رہ گیا ۔ جوں جوں اس کا حُسن زائل ہوتا جاتا تھا لڑکی کا عشق بھی سرد پڑتا جاتا تھا ۔ تا آنکہ وہ انتہائی مکروہ اور بدصورت ہو گیا اور لڑکی اس کے وبالِ عشق سے یکسر نجات پا گئی ۔

چوں ز رنجوری جمالِ او نماند — جانِ دختر در وبالِ او نماند (۲۰۳)

چونکہ زشت و ناخوش و رُخ زرد شد — اندک اندک در دلِ او سرد شد (۲۰۴)

اور کیوں نہ ہوتا — جو عشق محض آسودگیٔ نفس کے لیے اختیار کیا جائے اس کا یہی انجام ہوتا ہے ایسے عشق کے مقدر میں سوائے ننگ و عار کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے ۔ کیونکہ ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

جہاں تک اس تمثیل کے ڈرامائی اختتام کا تعلق ہے اسے یہاں ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ یہی اس حکایت کا نقطۂ عروج (climax) ہے ۔ لیکن رومی ڈرامہ نویس نہیں بلکہ تمثیل نگار ہیں ۔ اور ابتدا میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ تمثیل میں طوالت و اطناب کا سلسلہ انتشار کی حد تک بھی پہنچ سکتا ہے بلکہ اکثر پہنچ جاتا ہے کیونکہ تمثیل نگاری ان پابندیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ جو ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈرامہ نگار پر عاید ہوتی ہیں - یہاں تو مقصود ایک عقیدے یا تصوّر کی تبلیغ و اشاعت ہے - لہٰذا مولانا کے ہاں یہ تمثیل اس مرکزی تصوّر کی وضاحت کے بعد بھی "مزید وضاحت" کے لیے جاری رہتی ہے - چنانچہ :-

زرگر نہ صرف بدصورت ہو جاتا ہے بلکہ آہستہ آہستہ گھل گھل کر مر جاتا ہے - آخری وقت میں جو الفاظ اس کی زبان سے نکلتے ہیں وہ بجائے خود عبرت آموز اور آفاقی صداقت کے حامل ہیں - وہ کہتا ہے کہ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے لیکن ظالموں کو یاد رکھنا چاہیے کہ مجھ جیسے شخص کا خون رائیگاں نہیں جائے گا - آج یہ مجھ پر گزری ہے تو کل اُن کی باری آجائے گی - کیونکہ یہ دنیا تو ایک پہاڑ ہے اور ہمارے افعال اس کی صدائے باز گشت ہیں جیسی صدا ہوگی ویسی ہی اس کی بازگشت ہوگی - جیسا کروگے ویسا بھروگے - یہ کہہ کر جان دے دی اور کنیز رنجِ عشق سے پاک ہوگئی ؎

برمن است امروز و فردا بر ویست — خونِ چوں من کس چنیں ضائع کے است (۲۱۳)

ایں جہاں کوہ است و فعلِ ما ندا — سوئے ما آید نداہا را صدا (۲۱۵)

ایں بگفت و رفت در دم زیرِ خاک — آں کنیزک شد ز رنجِ عشق پاک (۲۱۶)

لیکن کون سے رنجِ عشق سے ؟ اس عشق سے جو درحقیقت عشق نہ تھا محض لذتِ نفس کا بہانہ تھا - اور جس رنج میں وہ گرفتار تھی وہ بھی غمِ حقیقی نہ تھا ورنہ اس سے نجات کی نہ کوئی صورت ہوتی ہے نہ خواہش ! یہی وجہ تھی کہ کنیزک کو اس کی موت کا کوئی رنج نہ ہوا - کیونکہ نفس خود فانی ہے لہٰذا اس کا عشق بھی فانی - جو شے بالآخر مردہ ہو جانے والی ہو اس کا عشق اس کے ساتھ ہی دم توڑ دیتا ہے - کنیز تو زرگر کے صرف ظاہری حسن و جمال کی عاشق تھی - وہ گھٹنا شروع ہوا تو اس نام نہاد عشق نے بھی گھٹنا شروع کر دیا - اور جب وہ ختم ہو گیا تو عشق بھی ختم ہو گیا - انتظار اسی کا کیا کرتے ہیں جس کے واپس آنے کی امید ہو - جب یہ امید ہی نہ رہے تو شبِ ہجر کی روایتی طوالت بھی باقی نہیں رہتی ؎

بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

اور مردے کے بارے میں تو یقین ہوتا ہے کہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا - پس اگر عشق اس کے ظاہری حسن سے ہو تو وہ کیونکر دیرپا ہو سکتا ہے ؟ مولانا نے اس تمام بحث کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زانکہ عشقِ مردگاں پایندہ نیست — زانکہ مردہ سوئے ما آیندہ نیست (۲۱۷)

اس کے بعد ایک تمثیل نگار کا فرض ادا کرتے ہوئے مولانا بتاتے ہیں کہ یہ تو تھی عشقِ مردہ کی بات جو ایک فانی کو دوسرے فانی سے ہوتا ہے لیکن ایک عشق وہ بھی ہے جسے کبھی فنا نہیں اور وہ ہے عشقِ حقیقی۔ یعنی ذاتِ خداوندی کے ساتھ عشق۔ وہ ذاتِ حقیقی چونکہ خود زندہ ہے لہٰذا اس کے ساتھ کیا جانے والا عشق بھی زندہ رہتا ہے بلکہ ہر دم تازہ و شگفتہ رہتا ہے اور رکھتا ہے۔

عشقِ زندہ در رواں و در بصر — ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر (۲۱۸)

عشقِ آں زندہ گزیں کو باقی است — وز شرابِ جاں فزایت ساقی است (۲۱۹)

عشقِ آں بگزیں کہ جملہ انبیاء — یافتند از عشقِ او کار و کیا[1] (۲۲۰)

اور یہ کبھی تصور نہ کرنا چاہیے کہ کہاں ہم اور کہاں انبیا کرام! کہاں ہم جیسے گنہ گار اور کہاں عشقِ الٰہی! ہمیں کب اس کی بارگاہ تک رسائی ہو سکتی ہے! مولانا کمال شفقت و دلسوزی سے سمجھاتے ہیں کہ ایسا مت سوچو، یوں نہ کہو، وہ شاہ دوسرا بے شک بلند و عظیم ہے لیکن وہ کسی سے دور نہیں۔ وہ ہر پکارنے والے کے قریب ہے، اس لیے کہ وہ کریم ہے اور صاحبِ کرم کے لیے کسی کی مشکل آسان کرنا کونسی بڑی بات ہے!

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست — با کریماں کارہا دشوار نیست (۲۲۱)

یہ نصیحت بھی ہو چکی لیکن تمثیل نگار کے نزدیک ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا۔ ایک ڈرامہ نگار ڈرامے کے خاتمہ پر بہت کچھ اپنے قاری یا ناظر کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود سوچے یا نہ سوچے کہ آخر فلاں کردار کا انجام کیا ہوا ہوگا۔ یا یہ کہ فلاں کا سلوک آخر کہاں تک واجب یا ناواجب تھا۔ لیکن تمثیل نگار یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ قاری کا ذاتی فیصلہ اس عقیدے کے بالکل برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ جس کے لیے تمثیل معرضِ وجود میں لائی گئی ہے۔ اس کا مقصد تو اس عقیدے پہ مائل کرنا بلکہ اس کا قائل کرانا ہے۔ یہی چیز تمثیل کو ڈرامے سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ مولانا نے آخری نصیحت تک جو کچھ کہا وہ بہت سے اخلاقی اور حکیمانہ اسباق و رموز کا حامل ہے مگر عام قاری کی ایک

---

[1] کار و کیا یعنی عزّ و شرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الجھن اس سے پوری طرح رفع نہیں ہو پاتی۔ اور وہ ہے طبیب کے ہاتھوں زرگر کا قتل۔ چنانچہ ایک مستقل عنوان کے تحت مولانا رفع اشتباہ کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں خالص متکلمانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ خاص طور پہ پیش نظر رکھنے کا ہے کہ علم الکلام کا اثر و نفوذ ان ہی اذہان پہ ہو سکتا ہے جو مائل بہ حق ہوں لیکن تذبذب، گومگو یا بہت ہوئے تو تشکیک میں گرفتار ہوں، یکسر منکر یا مرتد نہ ہوں۔ رومی جانتے ہیں کہ تمثیل کے اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے قاری کا ذہن ان کے متکلمانہ دلائل سننے کے لیے خاصی حد تک تیار ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب اسے قائل کرانا بہت دشوار نہیں ہے

تمثیل میں خطابت کا عنصر

چنانچہ وہ :۔ ۱۔ سب سے پہلے تو قاری کو یاد دلاتے ہیں کہ بادشاہ کوئی عیش پرست حکمران نہیں تھا۔ نفس کا غلام نہ تھا۔ اس کی خود سپردگی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے آپ کو کلیتہً پیر غیبی کے حوالے کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی آمد کو منجانب اللہ تصور کرتا تھا۔ اس لیے کنیزک کا نکاح زرگر کے ساتھ کر دیا۔

۲۔ دوسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ مہمان غیبی کو درحقیقت حق تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا گیا تھا اور اس کے ہاتھوں زرگر کا قتل ایک ایسی ہی مصلحت خاص کے تحت تھا جیسے کہ حضرت خضرؑ کے ہاتھوں ایک معصوم بچے کا قتل واقع ہوا تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ لیکن خضرؑ کی زبانی مشیتِ ایزدی کی وضاحت کے بعد حضرت موسیٰؑ کا تمام اشتباہ دور ہو گیا۔ اگرچہ عام لوگوں کے لیے اب بھی اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ حالانکہ سیدھی سادی بات ہے کہ جس ذات پاک نے جان کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ اسے واپس بھی لے سکتی ہے۔ وہ غرقِ دریا کر کے لے لے یا مبتلائے وبا کر کے یا قتل کروا کے، یہ تو اس کی مرضی ہے، ہم اس پہ معترض کیونکر ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ نعمت قبول کرتے وقت ہم نے کونسی شرط عاید کی تھی کہ مثلاً ہمیں ضرور کسی دولت مند کے گھر میں پیدا کیا جائے یا شاہی گھرانے کے فرد کی حیثیت سے جنم دلایا جائے۔ اس نے جیسا چاہا اور جہاں چاہا پیدا کر دیا اور جیسے چاہے گا واپس بلا لے گا۔ (یاد رہے کہ یہ کسی خاص معاشرے کے ایک فرد کے ہاتھوں دوسرے فرد کا مقدمۂ قتل نہیں بلکہ دنیائے تمثیل کے ایک بزرگِ خدا رسیدہ کے ہاتھوں ایک بندۂ حرص و ہوا کا خاتمہ ہے جس نے چند ماہ اس دوشیزہ کو زینتِ آغوش بنائے رکھا اور پھر اس گرفتارِ محبت کی وفا و محبت کا لحاظ کیے بغیر دوبارہ فروخت کر ڈالا اور پھر اس کی تسکین خاطر کے لیے نہیں بلکہ مال و دولت کے لالچ میں اس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکاح کرنے میں بھی عار محسوس نہ کی۔ صاحبِ تمثیل کا مقصد جہاں حرص و شہوت کی مذمت کرنا تھا وہاں یہ بات ذہن نشین کرانا بھی تھا کہ ظاہری رنگ و جمال سے دل بہلانے اور نفسانی آسودگی حاصل کرنے کو عشق نہیں کہتے۔ یہ رُوسیاہی و بدبختی ہے جس سے ہر بندۂ حق کو پناہ مانگنی چاہیے)۔

۳۔ تشریح بالا کی روشنی میں مولانا کہتے ہیں کہ بادشاہ اور طبیب دونوں حرص و شہوت سے پاک تھے انھوں نے جو کچھ کیا نیک تھا۔ اگرچہ ظاہراً سے "نیکیٔ بدی نما" کہہ سکتے ہیں۔ خضرؑ نے اگر کشتی کو توڑ دیا تھا تو اس شکست میں جو درستی پنہاں تھی وہ از خود ظاہر ہے۔ اُس کشتی کا توڑنا ظلم نہیں تھا بلکہ اس کو نہ توڑنا اس غریب ملاح پر ظلم ہوتا۔ پس اس زرگر کو قتل کرنے میں بھی ایسی ہی مصلحت پنہاں تھی جس تک عام ذہن کی رسائی دلیل و برہان کی بنا پر تو نہیں ہو سکتی لیکن رضائے الٰہی پر ایمان لانے سے البتہ یہ خلش باقی نہیں رہ سکتی۔ وہم میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اس میں تو خضرؑ کے سامنے حضرت موسیٰؑ بھی مبتلا ہو گئے تھے، پھر عام انسان کس شمار میں ہے۔ انھیں بے پر کی اڑانے کا کیا حق پہنچتا ہے۔

۴۔ مولانا کہتے ہیں کہ میں کسی ایسے شخص کو لائقِ مدح و ستائش تصور نہیں کرتا جو مسلم آزادی یا مسلم کشتی کا مرتکب ہوا ہو یا ہو سکتا ہو۔ لیکن بادشاہ کا ستائش گر اس لیے ہوں کہ وہ واقعی اللہ کے خاص بندوں میں سے تھا۔ یہی حال مردِ غیبی کا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا حق تعالیٰ کی خاطر کیا۔ بادشاہ کی خوشنودی اس کا مقصود نہ تھا۔

۵۔ آخر میں مولانا اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں پاکیزہ و پاک دامن لوگوں کو اپنے ذاتی ظن و قیاس کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش نہ کرنا چاہیے کیونکہ ہمارا قیاس حقیقت کے بالکل برعکس بھی ہو سکتا ہے اور مضحکہ خیز حد تک غلط ثابت ہو سکتا ہے۔

ان تمام دلائل کو مثنویٔ معنوی میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

کشتنِ آں مرد بر دستِ حکیم	نے پئے امید بود و نے زِ بیم	(۲۲۲)
او نکشتش از برائے طبعِ شاہ	تا نیامد امر و الہام از الٰہ	(۲۲۳)
آں پسر را کش خضر ببرید حلق	سرّ آں را در نیابد عامِ خلق	(۲۲۴)
آں کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست	نائب است و دستِ او دستِ خداست	(۲۲۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاک بود از شہوت و حرص و ہوا | نیک کرد او لیک نیک بد نما (۲۲۵)
گر خضر در بحر کشتی را شکست | صد درستی در شکست خضر ہست (۲۲۶)
وہم موسیٰ با ہمہ نور و ہنر | شد ازاں محجوب تو بے پر مپر (۲۳۷)

. . . .

گر بُدے خونِ مسلماں کام او | کافرم گر بُردمے من نام او
شاہ بود و شاہ بس آگاہ بود | خاص بود و خاصۂ اللہ بُود

. . . .

تو قیاس از خویش می گیری و لیک | دُور دُور افتادۂ بنگر تو نیک

اس تمثیل کا یہ آخری شعر دراصل اس سے اگلی تمثیل کا مرکزی خیال ہے یعنی وہ حکایت اسی شعر کی تمثیل ہے اور یوں چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا گیا ہے اور اس ایک تمثیل سے بیسیوں ضمنی تمثیل اور سینکڑوں تحتی قصّے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں جو مثنوی مولوی کے چھ ضخیم دفاتر پر محیط ہیں، جن میں بظاہر انتشار کی کیفیت دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک ہی وحدت کی کڑیاں ہیں جنھیں کمال چابک دستی سے ایک رشتے میں پرو دیا گیا ہے اور یہی مولانا رومی کی تمثیل نگاری کا کمال ہے۔

رُوحِ اسلام

اُردو ترجمہ

سپرٹ آف اسلام

سید امیر علی کی اس شہرۂ آفاق کتاب کا عربی، فارسی اور بعض دوسری اسلامی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام کے اساسی عقاید کی حقانیت اور اس کی عالمگیر تہذیب کی برتری کو عہدِ حاضر کے عقلی و فلسفیانہ معیار پر پرکھا ہے۔ اصل کتاب انگریزی زبان کا ایک ادبی شاہکار ہے۔ سید ہادی حسن صاحب نے کتاب کے اُردو ترجمے میں اس کی ادبی شان کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔

ملنے کا پتہ : ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

© rasailojaraid.com